© rasailojaraid.com

تاریخ اسلام
خلافتِ راشدہ و بنی اُمیہ

از جناب عبد الرؤف صاحب ایم اے

گذشتہ دنوں جناب خورشید احمد فارق پروفیسر عربی دہلی یونیورسٹی کی تصنیف موسوم بہ "تاریخ اسلام۔ خلافتِ راشدہ و بنی امیہ" کے مطالعہ کرنے کا موقع نصیب ہوا۔ مذکورہ تصنیف" جو کم و بیش پچاس پچپن مورخین متقدمین و متاخرین کے اور بجنسہ Imaginos مصادر و مراجع کو کھنگال کر نظر گاہ عام پر لائی گئی ہے کی تصریحات کے ضمن میں فاضل مصنف نے وضاحت کرتے ہوئے صراحۃً یہ فرمایا ہے کہ "کتاب میں ہماری بعض تصریحات قاری کو روایتی ڈگر سے ہٹی ہوئی ملیں گی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى (حق اور انصاف کی بات کہو چاہے صاحبِ معاملہ تمہارا رشتے دار ہی کیوں نہ ہو) کے حکیمانہ قول پر عمل کرنے کی کوشش کی ہے۔" مگر کتاب کا از ابتدا تا انتہا مطالعہ کرنے پر اپنی کم نظری کے باوصف محسوس ہوا کہ نہ صرف بعض، بلکہ بیشتر تصریحات کے سلسلہ میں اس حکیمانہ قول سے صرف نظر کرتے ہوئے تصویر کے صرف ایک ہی رُخ کو نمایاں کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ سطورِ ذیل کے پڑھنے سے قارئین پر خاکسار کا یہ تاثر واضح ہو جائے گا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فاضل پروفیسر صاحب مذکورہ تصنیف کے صفحہ ۳ پر خلیفۂ اول سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے وظیفہ کی بابت فرماتے ہیں: خلیفہ ہوکر ابوبکر صدیقؓ کی ذمہ داریاں اتنی بڑھ گئیں کہ تجارت چھوڑنا پڑی۔ اس کی تلافی انھوں نے بیت المال سے کی جس طرح رسول اللہ خالصہ املاک سے اپنے متعلقین کی ضروریات رفع کرتے تھے اسی طرح ابوبکر صدیقؓ نقد، جنس، کپڑا، اونٹ، غلام غرضیکہ جس چیز کی بھی ضرورت ہوتی بیت المال سے لے لیتے تھے۔۔۔۔" یہی تاثر ۱۰۲ نیز دیگر صفحات پر بھی بہ اندک تغیر دیا گیا ہے۔ مگر اس بات کا کہیں اشارۃً و کنایۃً بھی ذکر نہیں فرمایا کہ انھوں نے اپنی سوا دو سالہ مدتِ خلافت (۱۱-۱۳ھ) میں جو کچھ حقِ خدمت بیت المال سے وصول کیا تھا اس کا حساب لگوا کر اپنی حالتِ احتضار کے قریب واپس بیت المال میں جمع کروانے کی وصیت فرمادی تھی۔ جسے حسب وصیت واپس کر دیا گیا۔ یہ مال جب خلیفۂ ثانی حضرتِ فاروقؓ اعظم کی خدمت میں پہونچا تو بے ساختہ اُن کا دل بھر آیا وہ روتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے "اے ابوبکر! تم نے اپنے جانشینوں کا کام بہت دشوار کر دیا۔"[1]

حضرت علیؓ کے تخلف عن البیعۃ کے بارے میں مصنفِ محترم نے فرمایا ہے۔ "علی حیدرؓ کی بیوی فاطمہؓ بنتِ رسول اللہؐ ابوبکر صدیقؓ سے سخت ناراض تھیں اور علی حیدرؓ کی بیعت کی راہ میں سنگ گراں، ان کی ناراضگی کی ایک وجہ یہ تھی کہ ابوبکر صدیقؓ اُس عظیم منصب پر فائز ہوگئے تھے جو اُن کی رائے میں اُن کے شوہر

---

[1] برائے تفصیل ملاحظہ ہو صدیقِ اکبر مرتبہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایم۔ اے طبع سوم صفحہ ۳۰۲، تاریخ الخلفاء مترجم اقبال الدین احمد صفحہ ۱۲۱، خلافت وملوکیت صفحہ ۸۴ طبع سوم از مولانا ابوالاعلیٰ مودودی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو ملنا چاہیے تھا۔ دوسرے یہ کہ ابوبکر صدیق رضؓ نے انھیں رسول اللہؐ کی خالصہ جائیداد دینے سے انکار کردیا تھا جو مخیریق یہودی کے سات نخلستانوں، خیبر، فدک کے فارموں اور باغوں پر مشتمل تھی اور جس کا فاطمہؓ خود کو قدرتی وارث تصور کرتی تھیں، ابوبکر صدیق رضؓ کی خلافت کے چند ماہ بعد جب اُن (حضرت فاطمہ رضؓ) کا انتقال ہوگیا..... تو علی حیدر رضؓ نے بُرے دل سے اُن کی بیعت کرلی ..... علی حیدر رضؓ نے بیعت تو کرلی لیکن اُن کا دل صاف نہیں ہوا (ص۷) علی حیدر نے بی بی فاطمہ رضؓ کی حین حیات ابوبکر صدیق رضؓ کی بیعت نہیں کی تھی (ص۹۲) خلافت سے محرومی کے بعد اس دوسری ناکامی (خالصہ جائداد سے محرومی) نے علی حیدر رضؓ کی طبیعت سخت منغص کردی، حکومت کے خلاف اُن کے تیور چڑھ گئے اور زبان طعن کھل گئی (ص۲۰۱-۲۰۱)

لیکن حضرت علی رضؓ کے بیعتِ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ سے تخلف (پیچھے رہنا) کے بارے میں اگر ہم عصرِ حاضر کے محقق شہیر مولانا پروفیسر سعید احمد صاحب اکبرآبادی (المتوفی مئی ۱۹۸۵ء) کی تحقیق پر سرسری نگاہ بھی ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ حضرت علی رضؓ نے خلیفۂ اول سے بیعت کرنے میں ایک دن کا بھی توقف نہیں فرمایا۔ مولانائے موصوف فرماتے ہیں کہ "جب ابوبکر رضؓ منبر پر بیٹھ گئے تو انھوں نے لوگوں پر ایک نظر ڈالی اور جب علی رضؓ کو نہیں دیکھا تو ان کی نسبت پوچھا اس پر کچھ انصاری کھڑے ہوئے اور جاکر علی رضؓ کو لے آئے۔ ابوبکر رضؓ نے ان سے کہا کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی اور داماد بھی ہیں، کیا آپ مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنا چاہتے ہیں۔ علی رضؓ نے کہا اے خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ملامت نہ کیجیے، اس کے بعد علی رضؓ نے ابوبکر رضؓ سے بیعت کرلی۔[۱]" حضرت ابوسعید خدری رضؓ کی اس روایت سے ظاہر ہے کہ

---

[۱] صدیق اکبر رضؓ ص ۷۶۔ بحوالہ مستدرک للحاکم ۳/۷۶۔

© rasailojaraid.com

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت میں کسی طرح کا تخلف و اکراہ نہ تھا۔ یہ حدیث صحابۂ مذکور کے علاوہ دوسرے صحابۂ کرام سے بھی منقول ہے۔ لیکن چونکہ زیر تبصرہ تصنیف کے فاضل مصنف نے تقدیم و تاخیرِ زمانی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے کتبِ حدیث سے قدیم تر کتابوں کے حوالے دینا زیادہ مناسب نہ سمجھا" (ملاحظہ ہو برہان دہلی صفحہ ۹۹ بابت ماہ فروری ۱۹۸۴ء) چنانچہ موصوف نے (خواہ طبقۂ جمہور کے نزدیک احادیث شریفہ کا درجہ استناداً و درایتاً سیرت و مغازی کی روایات سے کہیں بڑھ کر ہے) احادیث سے ارادۃً صرف نظر کرتے ہوئے تاریخی مواد پر ہی اکتفا کیا۔ مگر متذکرہ بالا حدیث شریف کو محدثین کے علاوہ ابنِ سعد نے بھی روایت کیا ہے جسے پروفیسر صاحب قدیم تر مورخ سمجھتے ہیں (برہان ایضاً) جبکہ انہی ابنِ سعد سے موصوف نے کم و بیش ۱۲۵ مقامات پر مراجعت فرمائی ہے۔ بیعت کے سلسلہ میں دیگر قرائن و شواہد بھی اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ حضرت علیؓ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو ہر طرح خلافت کا اہل اور مستحق سمجھتے تھے اور یہ کہ بیعت کرتے وقت (اول روز ہی) نہ تو ان کی طبیعت میں کسی قسم کی تنغیص ہی تھی اور نہ دل میں کسی قسم کا تکدر و انقباض ہی جیسا کہ اس ضمن میں حضرت ابوسفیانؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مابین مکالمہ سے ظاہر ہوتا ہے [۲] فاضل مصنف کی محولہ بالا عبارت کے اس فقرہ "علی حیدرؓ کی بیوی فاطمہؓ بنت رسول اللہؐ ابوبکر صدیقؓ سے سخت ناراض تھیں اور علی حیدرؓ کی بیعت کی راہ میں سنگ گراں" سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کی پاکیزہ سرشت میں خلیفۂ اول کی طرف سے کسی طرح کا غبار نہ تھا اور وہ برضا و رغبت بیعت کرنے پر آمادہ تھے مگر حضرت فاطمہؓ ان کی

---

[۲] (پورا مکالمہ ملاحظہ ہو) خلافت و ملوکیت ص ۹۰ بحوالہ کنز العمال، طبری، ابن عبد البر الاستیعاب۔

© rasailojaraid.com

بیعت کی راہ میں سنگِ گراں تھیں اس لئے ان کی دل جوئی کی خاطر انھوں نے بیعت سے ممکن ہے کچھ توقف فرمایا ہو چنانچہ انھیں مجمع عام میں بلوانا پڑا۔ سو حضرت فاطمہؓ کی کبیدگی خاطر کا دوسرا سبب کہ انھیں رسول اللہؐ کی خالصہ جائیداد سے محروم کر دیا گیا تھا تو اِسے حضرت علیؓ کی بیعت سے علیحدگی کے تناظر میں پیش کرنا قیاس مع الفارق پر ہی منتج ہوگا کیونکہ خالصہ جائیداد سے محروم کرنے کا مسئلہ بیعت عامہ کے وقت معرضِ وجود ہی میں نہیں آیا ہوگا۔ اس کا تعلق نظمِ مملکت سے ہے جس کی طرف توجہ یقیناً بعد ہی میں مبذول کی گئی ہوگی۔

یہ تسلیم کرنا کہ حضرت علی حیدرؓ نے حضرت فاطمہؓ کے سانحۂ ارتحال کے بعد ہی با دلِ ناخواستہ بیعت کی تھی، شواہد و دلائل کے منافی ہوگا کیونکہ اولاً حضرت علیؓ کا بیعت نہ کرنا مسلمانوں کی اجتماعیت کے لئے سب سے بڑا حادثہ ہوسکتا تھا تو کیا اس وقت جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہی فوراً اسلام کی مخالفت کا طوفان امنڈ پڑا تھا۔ حضرت علیؓ جیسی عظیم المرتبت شخصیت یہ کبھی گوارا کر سکتی تھی کہ ان کے کسی فعل سے مسلمانوں کی اجتماعی وحدت میں کسی قسم کا کوئی رخنہ پیدا ہو؟ ثانیاً حضرت ابوبکر صدیقؓ کا اسلام میں جو مرتبہ تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آپؓ پر جو اعتماد تھا جس کے باعث آپؐ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کی طرف قولاً و عملاً اپنا رجحان ظاہر فرمایا تھا، حضرت علیؓ سے زیادہ ان سب سے زیادہ اور کون واقف ہوسکتا تھا۔ اس بنا پر کیا حضرت علیؓ سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ بایں ہمہ وہ بیعتِ عامہ کے وقت سب مسلمانوں سے الگ رہیں۔ حضرت ابوبکرؓ تو ابوبکرؓ! حضرت علیؓ کا کیرکٹر تو یہ ہے کہ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کی بیعتِ خلافت کے وقت بھی عام مسلمانوں سے الگ نہیں رہے اور اپنے لئے کوئی دعویٰ یا مطالبہ نہیں کیا رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔ ثالثاً یہ مان لیا جائے کہ حضرت علیؓ نے واقعی چھ ماہ تک بیعت نہیں کی تھی تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اِس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مدت میں جو اہم واقعات و حادثات پیش آئے اور جو درحقیقت اسلام کے لئے زندگی اور موت کا سوال تھے۔ حضرت علیؓ ان سب سے بے تعلق رہے۔ اور جب انھوں نے حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ کوئی تعاون اور اشتراکِ عمل نہیں کیا تو کیا واقعات سے اس کی تائید ہوتی ہے؟ رابعاً اچھا اگر مان بھی لیا جائے کہ حضرت علیؓ نے بیعت نہیں کی تو کیا حضرت ابوبکرؓ اس گونہ گیری کی صورت کو برداشت کر کے اسلامی وحدت کی دیوار میں یہ ایک رخنہ کھلا رہنے دے سکتے تھے؟ کیونکہ آپ اچھی طرح جانتے تھے کہ حضرت علیؓ کا بیعت نہ کرنا ان کو کم از کم بنو ہاشم کی حمایت و نصرت سے محروم کر دیتا ہے۔[1]" علاوہ ازیں "بعض معتدل خیال شیعی حضرات بھی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ اگرچہ رسول اللہؐ کے بعد سیدنا علیؑ افضل الناس اور خلافت کے سب سے زیادہ مستحق تھے لیکن انھوں نے حضرات شیخینؓ کی خلافت کو قبول کر لیا تھا اور اُن کے ساتھ اشتراکِ عمل اور تعاون کو ملحوظ رکھا نیز یہ کہ امت کو اپنے والی اور حاکم کے انتخاب کا حق ہے اور ان کا انتخاب رشد و ہدایت کے لئے کافی ہے۔[2]"

حضرت سعد بن عبادہؓ کی بیعت سے علیحدگی کا واقعہ بھی محل نظر ہے۔ آپ کے بارے میں موصوف ص ۱۳ پر فرماتے ہیں کہ جب وہ ڈرانے دھمکانے کے باوجود اپنے موقف سے نہیں ہٹے تو بڑے پیمانے پر خون خرابہ ہونے کے اندیشہ کے سبب اُن سے مزید تعرض نہیں کیا گیا تاہم انھیں مدینہ میں رہنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اور وہ جلاوطن ہو کر شام چلے گئے"۔ عبارت کے خط کشیدہ فقرہ سے ثابت ہوتا ہے

---

۱ صدیق اکبرؓ (مقدمہ ص ۲۱ – ۲۲)۔

۲ مذہب اور باطنی تعلیم از مرزا محمد سعید دہلوی۔ ایم۔ اے۔ آئی، ای۔ ایس۔ ص ۱۱۲ – ۱۱۴ مطبوعہ اردو مرکز لاہور۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ انہیں مدینۃ الرسول سے زبردستی نکال دیا گیا۔ مگر اس سلسلہ میں موصوف اپنے مضمون "اعتراضات کے جواب" ماہنامہ برہان دہلی بابت فروری ۱۹۸۲ء ص۹۹ پر یوں رقمطراز ہیں: "جب ابوبکر صدیقؓ اور اُن کے حامی قریشی صحابہ انصار کو خلافت دینے کے لئے تیار نہیں ہوئے اور ابوبکر صدیقؓ کا انتخاب ہوگیا تو بڑے انصاری لیڈر اور امیدوارِ خلافت سعد بن عبادہؓ نے نئے خلیفہ کی بیعت نہیں کی اور اُن کے پیچھے نماز پڑھنا چھوڑ دی اور بطور احتجاج گھربار چھوڑ کر شام کے شہر حوران چلے گئے۔" برہان میں مندرج عبارت کے اس آخری فقرہ سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ صحابیٔ مذکور خلیفۂ وقت پر جمہوری طرز کا دباؤ ڈالنے کی غرض سے بطور احتجاج از خود شام کے شہر حوران تشریف لے گئے تھے۔ اور ہمارے ناقص خیال کے مطابق اُن کا یہ احتجاج بالکل ایسا ہی ہوگا جیسا کہ آج کل جمہوری ممالک میں ممبرانِ حزب مخالف سرکار کی بعض پالیسیوں سے اختلاف کرتے ہوئے پارلیمنٹ سے واک آؤٹ کر جاتے ہیں۔ بہرحال محولہ بالا دونوں عبارتوں میں تناقض ہے جس سے صرف نظر کرتے ہوئے ہم یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ حضرت سعد بن عبادہؓ نے بھی حضرت صدیق اکبرؓ سے پہلے دن ہی بطیب خاطر بیعت کرلی تھی۔ رہا سوال حضرت سعدؓ کا بعہد صدیقی مدینہ میں اقامت گزینی کا تو صحیح یہ ہے کہ وہ بعہدِ خلیفۂ ثانی شام کے شہر حوران تشریف لے گئے ہیں جہاں اپنی رحلت کے وقت تک مقیم رہے۔[1] حتی خروج الی الشام فی اول خلافۃ عمر فمات بحوران)

---

[1] صدیق اکبر ص ۸۵-۸۶، سیرۃ الصدیق ص ۳۰۹، تاریخ ابن خلدون جلد اول قسط دوم ص ۲۴۰ مطبوعہ ادارہ درسِ قرآن دیوبند۔ کنزالعمال ۳/۱۳۴ مطبوعہ حیدرآباد دکن۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دراصل واقعات کی اکثر تصریحات مدینہ کے متاخرین اس سلسلے میں [illegible] کو مصنف نے اپنے مصادر و مراجع سے کتب احادیث یعنی صحاح ستہ کو خارج از بحث رکھا ہے کیونکہ موصوف کے نزدیک کتب سیر و مغازی کے مصنفین کو تقدم زمانی حاصل تھا اور انھوں نے مدینے میں اخبار و آثار کے معتبر معاشرے کے متمول و معزز لوگوں سے رسول اللہؐ کے صحابہ کے حالات اخذ کیے تھے۔ یہ مصنف خود بھی ثقہ تھے، ان میں سے کوئی ممتاز فقیہ تھا، کوئی مفتی، کوئی قاضی، کوئی عالم حدیث (ایضاً بیان ص ۹۸-۱۰۱)

گویا نعوذ باللہ محدثین کرام نے 'مستند ترین احادیث' کا تمام تر ذخیرہ غیر معتبر معاشرے کے مجہول و مردود اور اراذل لوگوں سے اخذ کیا تھا جو خدانخواستہ خود بھی غیر ثقہ تھے اور اُن میں نہ کوئی فقیہ تھا، نہ مفتی اور نہ قاضی۔ ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا۔

فاضل پروفیسر صاحب نے اس بارے میں جو چند نام گنوائے ہیں ان کی تقدیم و تاخیر زمانی اور ثقاہت و فقاہت کے سلسلے میں عرض کرنے سے پیشتر یہ گوش گذار کرنا چاہیں گے کہ موصوف کے مصنفین و مؤلفین کو خواہ تقدم زمانی کی فوقیت حاصل ہو مگر انہیں صحت روایت و درایت میں وہ فوقیت اور برتری ہرگز حاصل نہیں جو محدثین عظام کو حاصل رہی ہے اور پھر کلیہ کے طور پر یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ اگلے پچھلوں کے لئے بہت کچھ چھوڑ جاتے ہیں اور بسا اوقات علم کے پچھلے حاملین سے بعد کے سیکھنے والے بدرجہا فائق ہو جاتے ہیں اور اگرچہ وہ زمانے کے لحاظ سے اخیر میں ہوتے ہیں لیکن زندگی کے دوسرے شعبوں کے علاوہ علمی میدان میں بھی ایسے کارہائے نمایاں انجام دے جاتے ہیں جو متقدمین سے نہیں ہو سکے تھے۔ یہ بات محدثین کرام کی محنت و کاوش پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ بہر حال اگر موصوف صرف طبقہ قدما کے مؤرخین

---

۱ ماہنامہ برہان ایضاً ص ۹۸ — ۱۰۱ ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہی پر انحصار فرماتے تب تک بھی بجا اور درست تھا مگر پوری تصنیف میں جن پچاس ساٹھ مصنفین سے استفادہ و استناد فرمایا ہے، کیا وہ تمام طبقۂ قدما میں شمار ہوتے ہیں؟ موصوف نے جن مؤلفین کو قدیم ترین خیال فرمایا ہے اُن میں سے چند کے سنینِ وفات نذرِ ناظرین کیے جاتے ہیں:

موسیٰ بن عقبہ (۱۴۱ھ) محمد بن اسحٰق (۱۵۰-۱۵۱ھ) ابو اسمٰعیل ازدی بصری (۱۵۲ھ) ولید بن مسلم القرشی (۱۹۵ھ) محمد بن سعد صاحب طبقات (۲۳۰ھ) مصعب بن عبداللہ زبیری (۲۴۰ھ) محمد بن عمر الواقدی (۲۰۷ھ) سجستانی (۲۶۱ھ) ابن قتیبہ (۲۱۳ھ) بلاذری (۲۷۹ھ) دینوری (۲۸۱ھ) یعقوبی (۳۰۰ھ) وغیرہ

علامہ شبلی نعمانی رح نے تقریباً ۳۰۰ھ تک فوت ہونے والے مصنفین کو طبقۂ قدما میں شمار فرمایا ہے؎ بعد ازاں متاخرین کا دور ہے۔ ساتھ ہی اگر ہم محدثین کرام کے سنینِ وفات پر بھی ایک نظر ڈالیں تو علامہ شبلی نعمانی رح کے بقول وہ بھی طبقۂ قدما ہی میں شمار ہوں گے۔ امام بخاری رح (۲۵۶ھ) امام مسلم رح (۲۶۱ھ) امام ابن ماجہ رح (۲۷۳ھ) امام ابو داؤد (۲۷۵ھ) امام ترمذی (۲۷۹ھ) اور امام نسائی (۳۰۳ھ) مگر مستزاد یہ کہ صاحبِ تاریخ اسلام۔ خلافت راشدہ و بنی امیہ نے متاخرین سے بھی بھرپور فائدہ اٹھایا ہے مثلاً ابوالحسن علی بن حسین مسعودی المتوفی ۳۸۶ھ، ابو نعیم اصبہانی (۴۳۰ھ) حافظ ابو ربیع سلیمان بن موسیٰ الکلاعی صاحبِ الاکتفاء (۶۳۴ھ) ابن ابی الحدید (۶۵۵ھ) ابن ابی اصیبعہ (۶۶۸ھ) ابن کثیر صاحب البدایہ والنہایہ (۷۷۴ھ) وغیرہم۔ پھر ایسی صورت میں صحاح ستہ سے مراجعت نہ فرمانے کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر مراجعت فرماتے

؎ سیرۃ النبی ﷺ جلد اول ص ۳۵ مطبوعہ ۱۳۶۴ھ مطبع معارف اعظم گڑھ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تو کوئی وجہ نہ تھی کہ موصوف خلیفۂ اول کی ازواج کی تعداد صرف چار بتاتے (ص ۱) جبکہ بخاری شریف میں بروایت حضرت عائشہؓ صدیقہ مسطور ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے بنو کلب کی ایک عورت سے بھی، جس کا نام اُم بکر تھا شادی کی تھی، اور ہجرت کے وقت اُن کو طلاق دیدی تھی۔[1] اس طرح کی دیگر متعدد مثالیں سیرۃ النبی جلد اول میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ محققین یہ بھی کہتے ہیں کہ حدیث صحیح تمام ارباب سیر کی متفقہ روایت کے مقابلہ میں بھی قابل ترجیح ہے، نیز یہ کہ سیرت میں آج تک کوئی کتاب صحت کے التزام کے ساتھ نہیں لکھی گئی (علامہ شبلیؒ) لیکن تقدم زمانی ہی اگر معیارِ ثقاہت ہے تو اس سلسلے میں بھی ڈاکٹر محمد لیسین مظہر صدیقی فرماتے ہیں کہ ابتدائے تاریخ نگاری اسلام میں تو راویوں کی شخصیت، دیانت اور ثقاہت وغیرہ کو بھی نہیں پرکھا جاتا تھا۔[2]

سیرت نبوی کے اولین مؤلف محمد بن اسحٰق کی شخصیت متنازعہ فیہ ہے، اگر ایک گروہ اُن کو ثقہ سمجھتا ہے تو اسی درجہ کا دوسرا گروہ ان کو ناقابل اعتماد قرار دیتا ہے۔[3] مغازی نگاروں کے سرخیل واقدی کی روایتیں تو موجودہ دور کے سنجیدہ علمی حلقوں میں بالکل قابل قبول نہیں سمجھی جاتی ہیں کیونکہ اس کی لغویاتی مسلّم ہو چکی ہے۔[4] ایک صاحب نے تو اُس کے بارے میں بڑی ظرافت آمیز بات کہی ہے کہ اگر واقدی سچا ہے تو دنیا میں کوئی اُس کا ثانی نہیں اور اگر جھوٹا ہے

---

1. صدیقِ اکبرؓ ص ۴۵۲۔
2. ماہنامہ برہان دہلی ص ۳۵ بابت دسمبر ۱۹۸۲ء۔
3. ماہنامہ معارف اعظم گڈھ ص ۲۴۶-۲۴۷ بابت اپریل ۱۹۸۴ء۔
4. ایضاً۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تب بھی دنیا میں اس کا جواب نہیں[1]۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ فرماتے ہیں کہ "دنیا جانتی ہے کہ واقدی کی حیثیت ایک داستان گو کی ہے جس کا شمار معتبر مورخین میں نہیں ہو سکتا۔ تاریخ وسیرت میں اس کا حوالہ دینا ایسا ہی ہے جیسے آپ ملکہ الزبتھ کی سوانح عمری میں رینالڈس کا حوالہ دیں[2]۔" بہرکیف واقدی۔۔۔ جس کے متعلق تمام دنیا جانتی ہے کہ وہ اندھیری رات میں لکڑیاں چننے والا تھا اور اس کی غلط روایتوں، افسانہ طرازیوں اور جھوٹے قصے کہانیوں اور بے سند باتوں کی وجہ سے اُسے تمام علماء اسلام نے جھوٹا اور نامعتبر قرار دیا ہے[3]۔ علاوہ ازیں وہ شیعیت سے بھی متہم تھا اور تقیہ کیے رہتا تھا گو معتدل شیعہ تھا[4]۔ بہرحال باعثِ تسوید یہ کہ زیر بحث تصنیف کے مصنف نے کم وبیش بارہ[12] مقامات پر واقدی سے رجوع کیا ہے۔ فاضل پروفیسر صاحب نے اپنی تصنیف کے ص۱۰۲ پر مؤرخ ابنِ ابی الحدید کو معتزلی عالم قرار دیا ہے۔ جبکہ راقم الحروف کی محدود وناقص معلومات کی حد تک وہ نہ صرف معتزلی بلکہ مسلک تشیع کا بھی پیرو اور متبع تھا۔ مسلک اعتزال کے بانی واصل بن عطا متوفی ۱۳۱ھ / ۷۴۸ء کے بعد اس گروہ کے بعض مشاہیر شیعی عقائد کی طرف میلان رکھنے لگے تھے، چنانچہ اعتزال اور تشیع کی یکجائی کی تاریخ میں بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ مشہور ماہرِ لسانیات امام عمر بن بحر الجاحظ اور ماہر زبان دان ابن ابی الحدید شیعی مسلک اعتزال سے متاثر ہونے والے عرب علماء کی بہترین مثال ہیں۔ چنانچہ ابی الحدید کے شیعہ ہونے کی بنا پر ہی مولانا

۱؎ سیرۃ النبیؐ جلد اول ص۴۳ نیز ملاحظہ ہوں صفحات ۱۸، ۱۹، ۲۳، ۲۵ اور ۴۸۔

۲؎ مقالاتِ سلیمان جلد ۲ ص۱۱۸۔

۳؎ ماہنامہ معارف اعظم گڈھ ص۲۴۳ بابت ماہ ستمبر ۸۲ء نیز ماہ نومبر ۱۹۸۲ء ص۳۴۴۔

۴؎ سیرتِ نبوی کی اولین کتابیں اور اُن کے مؤلفین مترجم پروفیسر نثار احمد فاروقی ص۱۷۵۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے اپنی تصنیف "خلافت و ملوکیت" میں اس مضمون کی روایت نقل کر
لی ہے کہ سیدنا علیؓ نے بیت المال میں سے اپنے بھائی عقیلؓ بن ابی طالب کو
زائد از استحقاق کچھ دینے سے انکار کر دیا تھا[1] اور وہ بھی اس لئے کہ اس روایت
کی دوسرے مورخین مثلاً ابن قتیبہ اور حافظ ابن حجر تائید کرتے ہیں۔ جبکہ پروفیسر صاحب
نے اپنی تصنیف میں تقریباً ۲۷ مقامات میں سے ۱۴ مقامات پر تنہا ابن ابی الحدید
کی روایات پر انحصار کیا ہے[2]۔ مذکورۃ الصدر دونوں مشاہیر کے علاوہ صاحب
مروج الذہب مسعودی بھی معتزلی ہونے کے ساتھ شیعی بھی تھے۔ مصادر و مراجع
کے سلسلے میں تاثر خاصی قدرے طویل ضرور ہو گئی ہے مگر در اصل کسی بھی تصنیف کا معیار
مآخذ پر ہی منحصر ہوتا ہے۔ لہٰذا مندرجہ بالا چند مثالوں کے پیش نظر یہ نتیجہ نکالنا
نامناسب نہ ہوگا کہ زیر تبصرہ تصنیف کے دیگر مصادر بھی مشکوک ہوں گے۔ سیرت کی
بیشتر کتابوں کا پایہ نہایت بلند اور برتر ہے جیسا کہ سیرت ابن ہشام کے بارے میں
ایک مستشرق کہتا ہے کہ "سیرت نبوی کی عربی تصنیفات جیسے سیرت ابن ہشام کا پایہ
تاریخی حیثیت سے انجیل سے بڑھ کر ہے"[3] دیگر معاندین و مستشرقین نے بھی کتب
سیر و مغازی کی وقعت و صحت کا اعتراف کیا ہے۔

۱؎ خلافت و ملوکیت۔

۲؎ دیکھئے زیر بحث کتاب کے صفحات ۷، ۱۳، ۱۰۲، ۱۳۸، ۱۴۸، ۱۶۵، ۱۶۷،
۱۸۳، ۲۰۰، ۲۰۳، ۲۳۲ نیز ۲۲۵ وغیرہ۔

۳؎ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ بابت مارچ ۱۹۸۳ء ص ۱۶۳۔

© rasailojaraid.com